گوشہ گیری

گوشہ گیری کی مشروعیت

ایک طرف تو ایمان و اسلام کے لیے منظّم اجتماعی زندگی کا وجود اس حد تک ناگزیر ہے جس کی وضاحت پچھلے صفحات پیش کر رہے ہیں، دوسری طرف قرآن حکیم کے بعض اشارات اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعض کھلے ہوئے ارشادات سے معلوم ہوتا ہے کہ اجتماعیت سے یکسر ناآشنا اور گوشۂ تنہائی کی زندگی بھی غیر اسلامی زندگی نہیں، بلکہ ٹھیک اسلامی زندگی ہے، اور اسے اللہ و رسولؐ کی رضا حاصل ہے۔ مثلاً:

سورۂ کہف کے دوسرے رکوع کو پڑھیے، جہاں 'اصحابِ کہف' کا تذکرہ ہے۔ یہ اصحاب کہف وہ لوگ ہیں جو انسانی بستیوں سے دُور ہٹ کر ایک محفوظ غار میں جا بیٹھے تھے، اور وہیں اپنے اللہ کی یاد میں مشغول ہو رہے تھے۔ یوں کہیے کہ غیر اجتماعی زندگی کی آخری شکل انہوں نے اختیار کر لی تھی۔ قرآن مجید نے ان کی اس سرگزشت کو جس انداز میں بیان کیا ہے اس سے اُن کی اس روش پر کسی ہلکی سی ہلکی ناپسندیدگی کا بھی اظہار نہیں ہوتا۔ اس کے بخلاف اس نے اسے خدا پرستی کے ایک قابل قدر اور اونچے نمونے کی حیثیت سے پیش کیا ہے، اور ان غار نشینوں کو 'ایمان میں پختہ' اور 'ہدایت میں بلند مرتبہ' قرار دیا ہے:

اِنَّهُمْ فِتْيَةٌ اٰمَنُوْا بِرَبِّهِمْ وَزِدْنٰهُمْ هُدًى۔ (کہف: ۱۳)

''بلاشبہ یہ (کچھ) ایسے جوان تھے جو اپنے رب پر ایمان لائے تھے، اور جنھیں ہم نے ہدایت کی افزونی عطا فرمائی تھی۔''

اسی طرح یہ حدیثیں دیکھیے:

(۱) قَالَ رَجُلٌ اَیُّ النَّاسِ اَفْضَلُ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ قَالَ مُؤمِنٌ یُجَاھِدُ بِنَفْسِہٖ وَمَالِہٖ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ قَالَ ثُمَّ مَنْ قَالَ ثُمَّ مُؤْمِنٌ مُعْتَزِلٌ فِیْ شِعْبٍ مِّنَ الشِّعَابِ یَعْبُدُ رَبَّہٗ وَیَدَعُ النَّاسَ مِنْ شَرِّہٖ۔ (مسلم، باب فضل الجہاد والرباط)

''ایک شخص نے پوچھا: ''اے اللہ کے رسولؐ! سب سے افضل انسان کون سا ہے؟'' فرمایا: ''وہ مسلمان جو اپنی جان و مال سے اللہ کی راہ میں جہاد کرتا ہے۔'' اس نے کہا: ''پھر کون؟'' ارشاد ہوا ''پھر وہ مسلمان جو کسی گھاٹی میں جا کر گوشہ نشین ہو گیا ہو، وہاں اپنے رب کی عبادت کرتا ہو اور لوگوں کو اپنے شر سے دُور چھوڑے ہوئے ہو۔''

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ایک روایت میں ''یَدَعُ النَّاسَ مِنْ شَرِّہٖ'' کے موقع پر ''یَعْتَزِلُ شُرُوْرَ النَّاسِ'' (لوگوں کے شر کو چھوڑے ہوئے اور اس سے دُور رہتا ہو) کے الفاظ ہیں۔ (فتح الباری، جلد ۶، صفحہ ۴)

(۲) یَاْتِیْ عَلَی النَّاسِ زَمَانٌ خَیْرُ مَالِ الْمُسْلِمِ الْغَنَمُ یَتَّبِعُ بِھَا شَعْفَ الْجِبَالِ وَمَوَاقِعَ الْقَطْرِ یَفِرُّ بِدِیْنِہٖ مِنَ الْفِتَنِ۔ (بخاری باب العزلۃ راحۃ من خلاط السوء)

''لوگوں پر ایک ایسا زمانہ آنے والا ہے جب ایک مسلمان کی سب سے اچھی دولت اس کی بکریاں ہوں گی، جنھیں لے کر وہ پہاڑوں کی چوٹیوں اور پانی کی جگہوں میں گھومتا پھرے گا، اپنے دین کو سینے سے لگائے فتنوں سے بھاگتا رہے گا۔''

ان حدیثوں کے آئینے میں صاف دکھائی دیتا ہے کہ اگر مومن جماعتی زندگی سے الگ ہو کر یادِ حق میں مصروف ہو رہے تو یہ کوئی غلط بات نہ ہوگی، بلکہ ایک بہترین رویہ ہوگا جو اس نے اپنایا ہوگا۔

عزیمت نہیں، رخصت

بلاشبہ اس طرح کی باتیں اور ہدایتیں بھی قرآن اور حدیث میں موجود ہیں۔ اور جب ایک چیز قرآن اور حدیث میں موجود ہے تو وہ بھی ٹھیک اسی طرح 'اسلامی' ہی ہے جس طرح کہ کوئی اور

چیز ہوسکتی ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ یہاں 'اسلامی' ہونے کا مطلب کیا ہے؟ کیا یہ کہ یہ تنہائی کی زندگی بھی مطلقاً اسلامی زندگی ہے، اور جب بھی اسے اختیار کیا جائے گا ٹھیک اسی طرح معیاری اور اللہ و رسولؐ کی پسندیدہ زندگی قرار پائے گی جس طرح کہ منظّم اجتماعی زندگی قرار پا چکی ہے، یا کچھ اور؟ اس سوال کا صحیح جواب معلوم کرنے کے لیے ہمیں ذیل کی تین اصولی باتوں پر غور کرنا ہوگا:

(۱) ایک منظّم اجتماعی زندگی اختیار کرنے کی جو ہدایتیں مسلمانوں کو دی گئی ہیں ان کی نوعیت کیا ہے؟

(۲) انسان کے پیدا کیے جانے کی غرض و غایت، اور اُمت مسلمہ کا مقصد وجود، یہ دونوں چیزیں گوشہ نشینی کے رویے کو کس نظر سے دیکھتی ہیں؟

(۳) خود قرآن اور حدیث کے وہ ارشادات، جن سے گوشہ نشینی کے رویے کا 'اسلامی' ہونا ثابت ہوتا ہے، اس بارے میں عام اور بے قید ہدایت کی حیثیت رکھتے ہیں، یا حقیقت واقعی اس کے خلاف ہے؟

جہاں تک پہلی بات کا تعلق ہے، اس سلسلے کی ساری ضروری تفصیلات ہمارے سامنے آ ہی چکی ہیں۔ ان سے حقیقت واقعی قطعاً یہ نہیں معلوم ہوتی کہ جماعتی زندگی بھی اسلام کو مطلوب ہے، بلکہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ اصلاً صرف جماعتی زندگی ہی اسے مطلوب ہے۔

وہ صرف یہی نہیں کہتا کہ '' عَلَيْكُمْ بِالْجَمَاعَةِ '' (اجتماعی زندگی کو لازم پکڑو)۔

بلکہ یہ بھی کہتا ہے کہ '' اِيَّاكُمْ وَالْفُرْقَةَ '' (افتراق اور علیحدگی سے پوری طرح دُور رہو)۔

اور یہ کہ اِنَّمَا يَأْكُلُ الذِّئْبُ مِنَ الْغَنَمِ الْقَاصِيَةَ '' (گلے سے دُور اور الگ ہو جانے والی ہی بکری بھیڑیے کا لقمہ بنا کرتی ہے)۔

اس کا مطلب اس کے سوا اور کچھ نہیں لیا جا سکتا کہ شریعت نے جماعتی زندگی بسر کرنے کی جو ہدایت دی ہے اس کی تعمیل اختیاری نہیں بلکہ لازمی ہے۔

رہی دوسری بات، تو نہ تو انسان کے پیدا کیے جانے کی غرض و غایت ہی گوشہ گیری کے

رویے سے میل کھاتی ہے، نہ اُمتِ مسلمہ کا مقصدِ وجود ہی اسے گوارا کرتا ہے۔ انسان کے پیدا کیے جانے کی غرض و غایت قرآن حکیم نے اللہ تعالیٰ کی 'خلافت' اور اس کی 'عبادت' بتائی ہے۔ اگر گوشہ گیری کی زندگی بھی منظم اجتماعی زندگی ہی کی طرح علی الاطلاق اسلامی زندگی ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اس کا اختیار کرنا کسی حال میں بھی اور کسی شخص کے لیے بھی غلط نہیں ہوسکتا، ہر مسلمان اسے اختیار کرسکتا ہے، ہر فردِ ملت کو اس کی ترغیب دی جاسکتی ہے، بلکہ یوں کہیے کہ تاکید کی جاسکتی ہے۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ کم از کم منطقی طور پر ایک ایسی حالت کا بھی تصور کیا جاسکتا ہے، یا ایسی حالت بھی پسندیدہ اور مطلوب ہوسکتی ہے، جب کہ سارے مسلمان گوشہ میں جا بیٹھے ہوں۔ لیکن یہ صورتِ حال اگر وجود میں آجائے تو بجائے خود وہ چاہے جتنی بھی پسندیدہ ہو، اتنی بات تو بالکل قطعی ہے کہ اس کی موجودگی میں وہ غایت کبھی پوری نہ ہوسکے گی جس کے لیے انسان کو پیدا کیا گیا ہے۔ کیونکہ ایسی صورت میں اس زمین پر اللہ تعالیٰ کی 'خلافت' کا فریضہ ادا ہونے کا کوئی عملی امکان ہی باقی نہ رہ جائے گا، اور اس کی عبادت اور غلامانہ اطاعت اس طرح کہیں بھی انجام نہ دی جاسکے گی جس طرح اسے انجام دیا جانا چاہیے۔ اسی طرح اُمتِ مسلمہ کا مقصدِ وجود 'امر بالمعروف'، 'شہادتِ حق' اور 'اقامتِ دین' ٹھیرایا گیا ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ اُمت اگر گوشوں میں معتکف ہوجاتی ہے تو وہ کسی وقت بھی اپنے اس فرض سے عہدہ برآ ہوسکے گی! آخر جہاں کوئی معاشرہ ہی نہ ہو وہاں 'امر بالمعروف' کے کتنے مواقع پیش آسکیں گے؟ حق کی شہادت کس طرح دی جاسکے گی؟ اللہ کا دین کہاں اور کن لوگوں پر قائم کیا جاسکے گا؟

اب ان حدیثوں اور قرآنی ارشادات کو لیجیے جن سے گوشہ گیری کی مشروعیت ثابت ہوتی ہے:
پہلی حدیث میں جہاں کسی گھاٹی میں جاکر گوشہ نشین ہو جانے والے اور اپنے رب کی عبادت کرنے والے کو ایک اُونچے درجے کا مومن بتایا گیا ہے، وہیں اس کے اندر دو باتیں اور بھی موجود ہیں:

ایک تو یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے 'راہِ خدا میں اپنی جان و مال سے جہاد کرنے

والے مومن' اور' کسی گھاٹی میں گوشہ نشین ہو جانے والے مومن' دونوں کا ذکر ایک ہی ساتھ نہیں فرمایا ہے، بلکہ پوچھنے والے کے اس سوال پر کہ "سب سے افضل انسان کون ہے؟" آپ صرف یہ کہہ کر خاموش ہو رہے کہ "وہ مسلمان جو اپنی جان و مال سے اللہ کی راہ میں جہاد کرتا ہے" اور جب اس نے دوبارہ پوچھا کہ "پھر کون؟" تب اس دوسرے شخص کا تذکرہ فرمایا اور وہ بھی "پھر" کے لفظ کی صراحت کے ساتھ۔

دوسری یہ کہ اس گوشہ نشینی کی ایک خاص ضرورت اور اس کا ایک خاص محرک ہونا چاہیے۔ اور وہ یہ کہ انسان' دوسروں کو اپنے شر سے' یا اپنے آپ کو دوسروں کے شر سے، بچانا چاہتا ہو۔

یہی حال دوسری حدیث کا بھی ہے۔ اس میں بھی گوشہ گیری کی ترغیب کے ساتھ دو اہم باتیں ارشاد ہوئی ہیں:

ایک تو یہ کہ "لوگوں پر ایک ایسا زمانہ آنے والا ہے۔" دوسرے لفظوں میں یہ کہ وہ کوئی غیر معمولی زمانہ ہوگا جس کے کچھ خاص حالات ہوں گے۔

دوسری یہ کہ جب ایسا زمانہ آئے گا تو' خدا ترس لوگ اپنی بکریاں لے کر پہاڑوں اور گھاٹیوں میں اس لیے نکل جائیں گے، یا انھیں اس لیے نکل جانا چاہیے تا کہ ان کا دین فتنوں سے محفوظ رہے۔

اسی طرح اصحابِ کہف کے جس واقعے سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ قرآن حکیم گوشۂ تنہائی کی زندگی کو بھی پسندیدہ اسلامی زندگی قرار دیتا ہے، اس کی تفصیل میں یہ امور بھی موجود ہیں:

ایک تو یہ کہ ان حضرات کی تعداد چند سے زیادہ نہیں تھی، جب کہ ان کی پوری قوم مشرک تھی۔

دوسرے یہ کہ قوم کے سامنے انہوں نے اپنے ایمان کا علانیہ اظہار کیا، اسے توحید کی دعوت دی۔

اِذۡ قَامُوۡا فَقَالُوۡا رَبُّنَا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ. (کہف:۱۴)

نہ صرف دعوت دی، بلکہ اتمامِ حجت کی حد تک دعوت دی اور بحث و مناظرے میں اسے بند کر دیا۔

هٰۤؤُلَآءِ قَوۡمُنَا اتَّخَذُوۡا مِنۡ دُوۡنِهٖۤ اٰلِهَةً ؕ لَوۡلَا يَاۡتُوۡنَ عَلَيۡهِمۡ بِسُلۡطٰنٍۢ بَيِّنٍ. (کہف:۱۵)

تیسرے یہ کہ غار کو انہوں نے اپنی قیام گاہ نہیں بلکہ پناہ گاہ بنایا تھا، اور یہ پناہ بھی انہوں نے اس وقت لی تھی جب ان کی قوم انھیں برداشت کرنے سے انکار کر چکی تھی اور اب انھیں بستی میں ٹکے رہنے کے لیے اپنے ایمان اور اپنی جان میں سے ایک کی بھینٹ دینا ضروری ہو گیا تھا۔

اِنَّهُمۡ اِنۡ يَّظۡهَرُوۡا عَلَيۡكُمۡ يَرۡجُمُوۡكُمۡ اَوۡ يُعِيۡدُوۡكُمۡ فِىۡ مِلَّتِهِمۡ. (کہف:۲۰)

قرآن اور حدیث کے ان ارشادات کا یہ جائزہ صاف بتاتا ہے کہ ان سے گوشہ نشینی کا رویہ اختیار کرنے کی جو ہدایت ملتی ہے، وہ عام اور بے قید ہرگز نہیں ہے۔ بلکہ بعض قیدوں اور شرطوں کے ساتھ مقید ہے۔ کچھ خاص حالات ہیں جن کے اندر ہی اس رویے پر عمل ہوا کرتا ہے۔ ایک دینی ضرورت، یا یوں کہیے کہ ایک بہت بڑی دینی مجبوری ہوتی ہے جس کے تحت مسلمان کو اُدھر جانا پڑتا ہے۔

گوشہ گیری کی زندگی کس نوع کی اسلامی زندگی ہے؟ اس سوال کا جواب معلوم کرنے کے لیے جن مختلف پہلوؤں سے غور و فکر ہونا چاہیے تھا، ان سب پر ہم ضروری حد تک غور و فکر کر چکے۔ اس کی روشنی میں اس خیال کی قطعاً کوئی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی کہ گوشہ نشینی کی زندگی اور جماعتی زندگی، دونوں ہر حیثیت سے یکساں طور پر اسلامی زندگی ہیں۔ اس کے برخلاف حقیقت واقعی یہ قرار پاتی ہے کہ اصل اسلامی زندگی صرف جماعتی زندگی ہے، اور بنیادی طور پر صرف وہی قابل اختیار ہے۔ رہی گوشوں کی زندگی، تو وہ اصل اسلامی زندگی ہرگز نہیں ہے کہ اسے عام حالات میں اختیار کیا جا سکتا ہو۔ بلکہ وہ صرف 'عارضی قسم' کی اسلامی زندگی ہے، جسے بعض خاص حالات میں، اور انتہائی اہم مجبوری کے وقت ہی اختیار کیا جا سکتا ہے۔ یہ 'خاص حالات' فتنہ و شر کے حالات ہیں، اور یہ انتہائی اہم مجبوری، اپنے دین و ایمان کی مجبوری ہے۔ یعنی وہ جماعتی زندگی، جو مسلمان کو دراصل اپنے دینی تقاضے پورے کر سکنے اور اپنے ایمان کی نشو و نما ہی کے لیے مطلوب ہوتی ہے،

جب اپنی اس حیثیت سے بڑی حد تک محروم ہو جاتی ہے، اپنی یہ مطلوبہ افادیت کھو دیتی ہے، اور دین وایمان کے معاملے میں الٹا عمل کرنے لگتی ہے، تو وہ اسے چھوڑ دینے پر مجبور ہو جاتا ہے، اور بڑے قلق اور انتہائی حسرت کے ساتھ گوشوں والی زندگی گوارا کر لیتا ہے۔ جہاں انسانی تخلیق کی غرض و غایت، اور اُمتِ مسلمہ کا مقصدِ وجود پورا کر سکنے کے مواقع ایک قابلِ لحاظ حد تک بالکل ناپید ہوتے ہیں، اور اللہ کی بندگی صرف ادھوری ہی کی جا سکتی ہے۔

غرض ایمان واسلام کا اصل وطن تو جماعتی زندگی ہی ہے، اور وہ جیسا چاہیے وہیں پروان چڑھ سکتے اور برگ وبار لا سکتے ہیں۔ لیکن جب ان کا یہ 'وطن' انھیں اطمینان کا سانس نہیں لینے دیتا تو وہ مجبوراً سرزمینِ غیر میں پناہ گزین ہو جاتے ہیں، اور گوشوں میں جا کر مسافرت کی جیسی تیسی زندگی گزار لے جانے کے سوا ان کے لیے کوئی اور چارہ نہیں رہ جاتا۔

صرف یہی نہیں کہ گوشہ گیری کی زندگی عارضی قسم کی اسلامی زندگی ہے، بلکہ جماعتی زندگی کے مقابلے میں اس کا درجہ بھی 'ثانوی' قسم کا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اس زندگی کو مجبوری کی وجہ سے اور دین وایمان کے مفاد ہی میں اختیار کیا جاتا ہے، اور اس میں اپنی کسی کوتاہی کا دخل نہیں ہوتا، مگر اس کے باوجود امرِ واقعی یہی ہے، اور یہ 'مجبوری' اور 'بے قصوری' اس طرزِ زندگی کو اصل اسلامی زندگی کا ہم پایہ نہیں بنا دے سکتی، نہ گوشوں میں بیٹھ کر اللہ کی عبادت کرنے والا اس شخص کے برابر ہو سکتا ہے جو اجتماعی زندگی میں رہ کر یہ فرض بجا لاتا ہے۔ اس فرقِ مراتب کی وجہ بالکل کھلی ہوئی ہے۔ پہلے شخص کی عبادت، نماز روزے وغیرہ چند انفرادی اعمالِ بندگی تک محدود رہتی ہے، جب کہ دوسرے کی عبادت ان انفرادی اعمال سے شروع ہو کر جانی اور مالی جہاد فی سبیل اللہ جیسی آخری حدودِ بندگی تک وسیع ہوتی ہے۔ اس لیے حق یہی ہے کہ پہلے کا مرتبہ دوسرے سے فروتر ہو۔ یہ صرف عقل اور قیاس ہی کا فیصلہ نہیں ہے، بلکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مذکورۂ بالا ارشادات میں بھی اس کا ثبوت موجود ہے۔

پوچھنے والے نے جب پوچھا کہ سب سے افضل انسان کون ہوتا ہے؟ تو آپؐ نے اس کے جواب میں اللہ کی راہ میں اپنی جان ومال سے جہاد کرنے والے مومن، اور کسی گھاٹی میں گوشہ نشین ہو کر اللہ کی عبادت کرنے والے مومن، دونوں کا ساتھ ساتھ تذکرہ نہیں فرمایا، بلکہ صرف پہلی قسم کے مومن کا ذکر کر کے خاموش ہو رہے۔ جس کا واضح مطلب یہ ہے کہ حقیقی معنوں میں ''سب سے افضل انسان'' صرف اسی طرح کے اہل ایمان ہوتے ہیں، کوئی دوسرا مومن ان کا ہم مرتبہ نہیں ہو سکتا۔

چنانچہ جب دوبارہ پوچھا گیا کہ ''پھر کون؟'' تو ارشاد ہوا کہ:

''پھر وہ مومن جو کسی گھاٹی میں جا کر گوشہ نشین ہو گیا ہو اور وہاں اپنے رب کی عبادت کرتا ہو۔''

یہ پوچھنے والے کا ''پھر'' کا لفظ استعمال کرنا، اور آپؐ کی طرف سے جواب کا بھی اسی لفظ سے شروع ہونا اس حقیقت کو روشن تر کر دیتا ہے کہ گوشہ نشینی کا مقام جماعتی زندگی کے مقابلے میں بہرحال فروتر اور ثانوی درجے کا ہے۔ شریعت کی زبان میں اسے یوں کہا جائے گا کہ گوشہ گیری کا راستہ 'رخصت' کا راستہ ہے، عزیمت کا نہیں۔ چنانچہ امام ابوداوٗدؒ نے اپنی سنن میں گوشہ گیری سے متعلق حدیث بیان کرنے کے لیے باب ہی ''**الرخصة فی التبدی فی الفتنة**'' کے عنوان کا قائم کیا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اس طرز زندگی کے 'اسلامی' ہونے کے باوجود ہم کسی پیغمبر کا اسوہ اس کے حق میں نہیں پاتے۔ ہزاروں انبیا میں سے کوئی نہ تھا جس نے کبھی اس روش کو اپنایا ہو۔ حالانکہ انھیں جس طرح کے سخت حالات سے سابقہ پیش آیا تھا، ہم اس کا ٹھیک ٹھیک تصور بھی نہیں کر سکتے۔ لیکن چونکہ وہ اللہ کے رسول تھے، اس لیے ان کے لیے ایک ایسی روش کا اختیار کرنا ممکن نہ تھا جسے اختیار کرنے کے بعد وہ انسانی آبادیوں سے علیحدہ ہو رہتے، اور جو عزیمت کی نہیں رخصت کی راہ تھی۔ اور یہ اس لیے کہ انسانی آبادیوں سے علیحدہ ہو جانے کے بعد تو وہ پیغمبری کا فریضہ ہی انجام نہیں دے سکتے تھے، اور رخصت کی راہ اپنانے کی ضرورت انھیں اس لیے نہیں پیش آ سکتی تھی کہ لوگوں کو

اپنے شر سے بچانے یا اپنے (دین وایمان) کو دوسروں کے شر سے محفوظ رکھنے کا یہاں کوئی سوال ہی نہیں تھا۔ رہی جان کے خطرے کی بات، تو یہ حضرات اپنی جان کو اپنی سمجھتے ہی کب تھے کہ اسے بچانے کے لیے وقت کے جباروں سے دُور بھاگنے کے ضرورت مند ہوتے۔

حالات وشرائط

اب یہ بات بھی سمجھ لینی چاہیے کہ وہ کون سے مخصوص حالات ہیں جن میں شریعت نے رخصت کی یہ راہ اختیار کرنے کی تلقین فرمائی ہے؟ جہاں تک اس سوال کے اصولی جواب کا تعلق ہے وہ تو اُوپر کی بحث میں واضح طور پر موجود ہے۔ اور وہ یہ کہ اسلام کی مطلوبہ اجتماعی زندگی اور اس کی ذمہ داریوں سے کنارہ کش ہو جانے کی ہدایت یا رخصت صرف اس وقت ہے جب معاشرہ 'شر' اور 'فتنہ' کی لپیٹ میں آ گیا ہو، اور صرف اس شخص کو ہے جو اس شر اور فتنے سے اپنے دین وایمان کو بچانے کے لیے ایسا کرنا ضروری سمجھتا ہو۔ چنانچہ دوسری حدیث کے الفاظ:

"يَفِرُّ بِدِيْنِهٖ مِنَ الْفِتَنِ"

صاف اس حقیقت کی نشان دہی کر رہے ہیں۔ اسی طرح پہلی حدیث کے بارے میں بھی علما نے صراحت کی ہے کہ اس میں "کسی گھاٹی میں جا کر گوشہ نشین ہو جانے" کی جو بات فرمائی گئی ہے اس کا تعلق صرف فتنوں کے زمانے سے ہے۔

وهو مقيد بوقوع الفتن. (فتح الباری، جلد۶)

اور خود حدیث کے آخری الفاظ "يَدَعُ النَّاسَ مِنْ شَرِّهٖ" سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے۔

لیکن اس مجمل اور اصولی جواب سے بات غالباً پوری طرح واضح نہ ہو سکے گی۔ اس لیے ضرورت ہے کہ اس 'فتنے' اور 'شر' کی نوعیت متعین کی جائے جس کا ان حدیثوں میں ذکر ہے، اور معلوم کیا جائے کہ اس سے کس قسم کا فتنہ وشر مراد ہے؟ ظاہر ہے کہ اس سے مراد مطلق فتنہ وشر تو ہو نہیں سکتا، کیونکہ اس معنی کے لحاظ سے تو دنیا کا کوئی زمانہ بھی فتنے اور شر سے خالی نہ تھا۔ حتیٰ کہ خود

دورِ نبوت اور دورِ خلفائے راشدین بھی بے فتنہ اور بے شر نہ تھے۔ کیونکہ ان دنوں بھی کم از کم نفاق کے فتنے تو موجود ہی تھے، اور باہمی اختلافات کے خون ریز ہنگامے سر اٹھاتے رہتے تھے۔ اس سے معلوم ہوا کہ وہ 'فتنہ و شر' جس میں مومن کو اجتماعی زندگی سے اور اس کی ذمہ داریوں سے الگ ہو کر صرف اپنی ہی فکر میں لگ جانے کی رخصت دی گئی ہے، لازماً غیر معمولی قسم کا فتنہ و شر ہے۔ کس حد تک اور کس قسم کا غیر معمولی؟ اس امر کی وضاحت کے لیے مذکورہ احادیث کے ان جملوں پر پھر سے اور گہری نظر ڈالیے:

"یَفِرُّ بِدِیْنِہٖ مِنَ الْفِتَنِ" "یَعْتَزِلُ شُرُوْرُ النَّاسِ" "یَدَعُ النَّاسَ مِنْ شَرِّہٖ"

یہ الفاظ بتاتے ہیں کہ "شر" اور "فتنے" سے مراد معاشرے کے ایسے سخت ابتر حالات ہیں جن کے اندر مسلمان اپنی ساری حفاظتی تدبیروں کے باوجود اپنے دین و ایمان کو محفوظ نہ پاتا ہو، اور شر و باطل کے بڑھتے ہوئے زبردست دباؤ میں ان کا مستقبل اسے تاریک دکھائی دیتا ہو۔ اس حد تک تاریک کہ اب دوسروں کی برائیاں اس کے دل و دماغ پر بھی اثر ڈال دیں گی، اور وہ بھی ماحول کی نجاستوں میں لت پت ہو رہے گا، اور کچھ بعید نہیں کہ کل وہ خود ہی برائی کا پرچارک اور فتنہ و شر کا علم بردار بن جائے۔

یہیں سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ اگر حالات ایسے خراب نہ ہوں، کہ دین و ایمان کے حق میں انھیں اتنا خطرناک کہا جا سکے، تو پھر اس رخصت پر عمل کرنا صحیح نہ ہوگا، اور ایسی شکل میں مومن کو اس بات کی اجازت نہ ہوگی کہ جماعتی زندگی سے علیحدہ ہو جائے، ملی نظم و اجتماعیت کے مطالبات سے منہ موڑ لے، صرف اپنی ہی ذات سے واسطہ رکھے، اور ملت کو اپنے حال پر چھوڑ دے کہ وہ جس طرح چاہے اپنی اجتماعی حیثیت بھی کھوتی چلی جائے، اور اس کی راکھ کے اندر خیر و صلاح کی جو چنگاریاں دبی دبائی موجود ہوں وہ بھی روز بروز بجھتی چلی جائیں، اور اس طرح وہ اپنے مقصدِ وجود سے عملاً دور سے دور تر ہوتی چلی جائے۔ ہاں اس رخصت پر عمل اُس وقت ضرور

قابل برداشت ہوسکتا ہے جب ملت میں مطلوبہ نظم اجتماعی بالفعل موجود ہو، اور معاشرے میں خیر غالب ہو۔ ایسی حالت میں اگر کچھ لوگ اپنے مخصوص ذوق کی بنا پر گوشوں میں جا بیٹھیں اور باہر کی دنیا سے بے تعلق ہو رہیں، تو کہا جاسکے گا کہ ملت بحیثیت مجموعی اپنا فرض پورا کر رہی ہے اور اس کی بہت بڑی اکثریت اس کی خدمت اور پاسبانی میں لگی ہوئی ہے، اس لیے کوئی مضائقہ نہیں اگر کچھ لوگ گوشہ نشین ہو گئے ہیں اور اپنی ہی ذات تک اپنی تربیتی اور دینی کوششیں محدود کر بیٹھے ہیں، اگرچہ پھر بھی اتنی بات تو لازماً کہی جائے گی کہ انہوں نے ایک زیادہ اچھے کام کو چھوڑ کر کم اچھے کام پر قناعت کر لی ہے ـــــــ لیکن اگر ملت اس حال میں نہ ہو، اگر وہ اپنا جماعتی نظم کھوتی جا رہی ہو، اگر مومن ''الجماعۃ'' سے بھیڑ بنتے جا رہے ہوں، اگر اگر مسلم معاشرے کا اجتماعی رُخ اسلام کے بجائے کسی اور طرف ہو چلا ہو، مختصر یہ کہ صحیح اسلامی نظام اجتماعی اگر کارفرما باقی نہ رہ گیا ہو تو کسی واقعی خطرۂ دین کے بغیر گوشہ گیر ہو جانا اور ملت کی اجتماعی زندگی کو سسکتا چھوڑ دینا ہرگز اسلامی طرز بندگی اور دینی طریق زندگی نہیں۔

عمل کی صورتیں

آخر میں ایک مسئلہ اور وضاحت طلب رہ جاتا ہے، اور وہ یہ کہ 'گوشہ گیری' کی عملی شکل کیا ہوگی؟ اور 'اعتزال' (اجتماعی زندگی سے علیحدگی) کی جس روش کے اختیار کرنے کی رخصت شریعت نے دی ہے، اس کی حدود کیا ہیں؟ اس سوال کے جواب میں کسی ایک ہی صورت کا نام نہیں لیا جاسکتا۔ کیونکہ اس کا انحصار تمام تر حالات پر ہے، جو ہر شخص کے لیے، اور ہر زمانے میں یکساں نہیں ہو سکتے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ کسی شخص کے دین و ایمان کے لیے حالات جس حد تک ناسازگار اور خطرناک ہوں گے، اسی کی مناسبت سے اسے گوشہ نشینی اور اعتزال کی شکل بھی اختیار کرنی ہوگی، مثلاً:

یہ حالات اگر خدانخواستہ، ابتری کی اس حد کو پہنچ گئے ہوں کہ دین کے بنیادی اصولوں پر

بھی قائم رہنا دشوار ہو چکا ہو، اور اس کی بنیادی تعلیمات کا اعلان و اظہار بھی برداشت نہ کیا جاتا ہو تو اس وقت 'گوشہ گیری' کے انتہائی مفہوم اور اس کی آخری شکل کو اختیار کیا جائے گا۔ جس کی مثال اصحابِ کہف کے اُسوہ میں موجود ہے۔ انہوں نے مکمل علیحدگی اور غار نشینی اس وقت اختیار کی تھی جب ان کے لیے اپنی بستی کے اندر کلمۂ حق کہنے کی اجازت باقی نہ رہ گئی تھی، اور انھیں یقین سا ہو گیا تھا کہ اب دعوتِ حق لوگوں کے سامنے ہماری زبانوں سے نکلی کہ ہم پر پتھروں کی بارش شروع ہوئی۔

اور اگر حالات اتنے خطرناک نہ ہوئے ہوں تو اُس وقت گوشہ گیری اور علیحدگی کی جو شکل اپنائی جائے گی، وہ ایسی نہ ہوگی، بلکہ اس سے بہر حال کم تر درجے کی ہوگی۔ یعنی کچھ اس طرح کہ انسان آبادی کو یک قلم تو نہ چھوڑے، مگر عام اجتماعی معاملات سے الگ ہو جائے، فتنے کے علم برداروں کو اپنے حال پر چھوڑ دے، اور ان کی بھڑکائی ہوئی آگ کو بجھانے کے لیے ہاتھ اور زبان کی کوششوں کے بجائے صرف دل سے برا ماننے پر اکتفا کرلے۔ بس اپنی ناگزیر ضروریاتِ زندگی کے لیے کوئی جائز ذریعۂ معاش، جو بہر حال معمولی قسم ہی کا ہو سکتا ہے، اختیار کر لے اور اپنی آخرت کی فکر میں لگ جائے، نماز اور روزے، حج اور زکوٰۃ کا اہتمام رکھے اور عام انسانوں کے جو حقوق اس پر عائد ہوتے ہیں انھیں ادا کرتا رہے۔

جہاں تک عام اندازے کا تعلق ہے، ایک بدتر سے بدتر مسلم معاشرے میں بھی جس خراب صورت حال کا اندیشہ کیا جا سکتا ہے، وہ بس اسی قسم کی ہو سکتی ہے۔ چنانچہ خود ان حدیثوں میں، جن کے اندر اس 'اعتزال' اور گوشہ نشینی کی زندگی بسر کرنے کی رخصت یا ہدایت دی گئی ہے، نماز کی اقامت اور اللہ کی عبادت کے ساتھ ساتھ ادائے زکوٰۃ کا حکم بھی موجود ہے۔ یہ حکم صاف طور سے اسی حقیقت کی طرف اشارہ کر رہا ہے، کیونکہ زکوٰۃ کی ادائی اسی وقت عمل میں آسکتی ہے جب دوسرے انسانوں سے ربط و تعلق کچھ نہ کچھ باقی ہو۔ غاروں اور گپھاؤں میں تو اس کی کوئی عملی شکل

ممکن ہی نہ رہے گی۔

فیصلے میں احتیاط کی ضرورت

آخر میں اس اہم ترین حقیقت کا یاد دلا دینا بھی ضروری ہے کہ حالات کی نزاکت اور خطرناکی کا درجہ متعین کرنے میں بڑے سخت اور انتہائی بے لاگ جائزے سے کام لینا چاہیے۔ کیونکہ انسانی فطرت کے دو رُجحانات ایسے ہیں جو اس معاملے میں صحیح فیصلے تک پہنچنے میں زبردست روک بن سکتے ہیں اور بنتے رہے ہیں:

ایک تو گوشہ نشینی کا رُجحان۔

دوسرا تن آسانی کا رُجحان۔

اس لیے اس بات کا قوی اندیشہ ہے کہ کوئی شخص ان میں سے کسی رجحان کی بنا پر گوشہ گیری کی طرف بذاتِ خود مائل ہو جائے، اور اپنے اسی ذاتی میلان کے زیرِ اثر حالات کی خطرناکی کا اندازہ کرنے میں مبالغہ کر بیٹھے، اور انھیں اپنے دین و ایمان کے حق میں اتنا خطرناک سمجھ لے جتنا کہ وہ فی الواقع نہ ہوں اور پھر گوشہ نشینی کے بارے میں وارد ہونے والی حدیثوں کو اپنے لیے ایک سہارا بنا کر ملی تنظیم اور جماعتی زندگی سے الگ ہو جائے، یا اگر یہ تنظیم اور اجتماعیت موجود نہ ہو تو اسے ازسرِ نو قائم کرنے کی ذمہ داریوں سے اپنے آپ کو آزاد قرار دے لے۔ ظاہر ہے کہ اس کا یہ فیصلہ دراصل اپنے ذاتی ذوق و رُجحان کی تسکین کے لیے ہوگا، احادیثِ رسولؐ کی پیروی کے لیے نہ ہوگا۔

ایک مومن کی حقیقی پسند اور اس کی آخری کوشش تو اس کے بارے میں یہ ہونی چاہیے کہ جہاں تک ممکن ہو، اجتماعیت سے چمٹا رہے اور اس کی بقا و ترقی یا بحالی میں کوئی دقیقہ نہ اٹھا رکھے، اور اس سے علیحدگی کی اُسی وقت سوچے جب وہ اس کے دین و ایمان کے لیے فی الواقع کھلے ہوئے خطرے کی شکل اختیار کر چکی ہو۔ اور اس وقت بھی اس کی یہ علیحدگی کسی احساس پسندیدگی

کے ساتھ نہ ہونی چاہیے، کیونکہ اسلام نے دین اور دین داری کا جو تصور دیا ہے، اس کی رُو سے یہ فی الواقع کوئی پسند کی بات ہو ہی نہیں سکتی۔ یہ اجتماعی زندگی کو چھوڑ دینا کچھ بڑھے ہوئے ناخنوں کا تراش پھینکنا نہیں ہے کہ اس سے راحت محسوس کی جائے، بلکہ گوشت کا ناخن سے جدا ہو جانا ہے جس کی اذیت اٹھانے کے لیے کوئی ذی شعور اپنی خوشی سے کبھی تیار نہیں ہو سکتا۔

❀ ..... ❀ ..... ❀